طارق* پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ یوسف**

نسیم حجازی کے زمانے کا ادبی رنگ، ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Abstract: *Naseem Hijazi in the journey of novel one sided he stress on Muslims for unity, confidance truth and action, at the same place he forces upon to routed out the social evils and importance of jahad (relejious war). For provide the stability to Pakistan and alos fight with the conspiracy so as we could be able to acquainted those persons who are the enemies of nation. Any hour in the journey of his novel which is based on good manners we remember ou past, brightfull and glitering period. By this way we may able to prove our future as gladness and pleasurefull.*

نسیم حجازی کا زمانہ تبدیلی کی اُس راہ پر گامزن تھا، جب دنیا کے نقشے پر زبردست تغیرات رونما ہو رہے تھے۔ جہاں ایک جانب قوموں میں عروج و زوال کی داستان دہرائی جارہی تھی تو وہیں پر دوسری جانب برصغیر پاک وہند میں بھی تبدیلیاں برپا تھیں۔ پورا ایک معاشرہ صفِ ہستی سے مٹ رہا تھا تو اُس کی جگہ ایک ایسا سماج اپنی جگہ بنا رہا تھا، جو اپنی سوچ و فکر کے ساتھ پرانے معاشرے کی الٹ تھا۔ مغربی تہذیب آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہی تھی، اسی معاشرتی کشمکش میں جہاں کچھ نظریات و خیالات نے اِس گھٹن زدہ معاشرے کو اِس پر مجبور کیا کہ وہ کُھلے دل سے اُن رویوں کو قبول کرے جو مغرب اپنے ساتھ لے کر آیا ہے، اِس عمل نے جہاں کچھ منفی سوچ پروان چڑھائی وہاں یہ مثبت سوچ ضرور آگے آئی کہ انسان چونکہ تبدیلی پسند واقع ہوا ہے، وہ کسی ایک خیال پر متفق نہیں رہ سکتا اِس لیے انسان کو وقت کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف نظریات و خیالات کو اپنا ترجمان ضرور بنانا چاہیئے۔ اِس سے وہ سوچ پروان چڑھے گی جو نہ صرف قوم کے لیے بلکہ آنے والی نسل کے لیے بھی سود مند ثابت ہو گی۔

نسیم حجازی اُن تقاضوں کو سمجھتے تھے، جو نئے دور کی سوچ لے کر آتی ہے، لیکن وہ چونکہ ماضی پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے تہذیب واقدار کے ساتھ آزاد اور روشن خیالی کو بھی پسند کرتے تھے، انہیں اِس بات کا احساس تھا کہ انسان کو طاقت کا احساس اُس وقت ہوتا ہے، جب اُس کے اندر خود اعتمادی اپنی جگہ بنا پاتی ہے۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایسے دور میں جب ہر شخص یہ سوچنے اور محسوس کرنے لگ جائے کہ اُس کی زندگی کِس طرح اُن مضر اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے، جہاں وہ چاروں جانب سے گھرا ہوا ہے تو ادب اور زندگی کا رشتہ کیا اِس طرح کی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا کو بسائیں جو اپنے اندر ایسی وسعت رکھے جہاں سب انسان سکون و اطمینان حاصل کریں مجنوں گورکھپوری اپنی کتاب "ادب اور زندگی" میں لکھتے ہیں،

* اسسٹنٹ پروفیسر اینڈ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

** چیئرپرسن، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

"۔۔۔ادب بھی تاریخ ہے جس میں کسی ملک یا کسی قوم کے دور بہ دور بدلتے ہوئے تمدن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدہء بینادر کار ہے۔ فنون لطیفہ بالخصوص ادبیات کسی حد تک قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں۔

کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو، جس میں واقعیت اور تخلیت افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں جو ہمارے ذوقِ حُسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے"۔(۱)

اردو ادب کے حوالے سے ۱۹۳۶ء ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک جو ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو معرض وجود میں آئی، جس کا بنیادی نقطہ نظر ہی یہ تھا کہ اب انسانوں کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ایک پورے معاشرے میں ایک ایسی تبدیلی لائی جائے جو خاص طور پر ہندوستان کے انسانوں کو وہ حقوق دلائے، جو اُن کا بنیادی حق ہے۔ ترقی پسند تحریک اپنے عہد کی ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی جس نے آنے والے وقت پر نہ صرف گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ آج تک وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ نسیم حجازی نے اپنے فکر و عمل سے اُن فطری عناصر کو اپنے ناولوں میں سمیٹا جہاں کی فضا میں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جہاں روشنی کا ظہور مشکل تھا، جہالت کو مذہب کا درجہ حاصل تھا۔ علم جہالت کے آگے سر جھکائے کھڑا تھا۔ نسیم حجازی انسانی نفسیات کا شعور رکھتے تھے۔ ایسے میں جب ترقی پسند تحریک سامنے آئی تو اِس کارواں میں وہ افراد شامل تھے، جنھوں نے غربت وافلاس میں آنکھ کھولی، جو سمجھتے تھے کہ انسانوں کی تفریق کیا مسائل پیدا کرتی ہے، دیہات کی زندگی اپنے اندر کیا دُکھ سمیٹے ہوئے ہے۔ ان سب کی صداقت ایک ایسے شخص کے ہاتھ آئی جو خود انسانوں کا احترام کرنا جانتا تھا۔ یعنی ترقی پسند تحریک کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے انسان کی فلاح و بہبود کے لیے معاشرے کی جن قدروں کے خلاف بغاوت بلند کی، اُسی راہ پر نسیم حجازی نے اپنا ناول "انسان اور دیوتا" لکھا۔ جس طرح ہر نئے رجحان کی ابتداء میں مشکلات آتی ہیں، کیونکہ انسان تبدیلی کو اور ایک ایسی تبدیلی کو جو صدیوں سے اُس سے دور ہو، مشکل سے ہی قبول کر پاتا ہے، اِسی طرح ترقی پسند تحریک جس کے روح رواں میں سجاد ظہیر، منشی پریم چند، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، فراق گورکھ پوری، جوش ملیح آبادی جیسے دانشور شامل تھے۔ جس کا خطبہ اُس تحریک کی بیداری پر مشتمل تھا جو وقت کی ضرورت تھا۔ یوں انسان دوستی، زندگی کی صداقت اور انسان کا اصل مقام اُس کا محرک بنا۔ اِس تحریک کی صدارت کرتے ہوئے پریم چند کہتے ہیں،

"جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس میں ادب کا استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حُسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔۔۔ اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے، یہ اس کا مقصدِ اولیٰ ہے"۔(۲)

ترقی پسند تحریک نے انسان کا دُکھ پہچانا، اور اِسے دور کرنے کے لیے ہر وہ طریقہ استعمال کیا، جو اُس کے نزدیک جائز تھا۔ سیاسی و شعوری عمل سے سماج میں انسان کو بہتر بنانا، اور ایک ایسی جدوجہد سے گزارنا، جہاں پختگی اور شعوری سطح بہت بلند ہو، ترقی پسند تحریک کے اِن رجحانات نے برصغیر کے لاکھوں انسانوں کے لیے ایک روشن اور درخشاں مستقبل کی تصویر پیش کی، بے شمار زاویے سامنے آئے، ایک ایسا نقطہء نظر پریم چند اور اُن کے رفقاء لے کر آئے تھے جس نے سچ کے دامن کو کبھی نہ چھوڑا اِس تحریک میں سجاد ظہیر، جیسے دانشور نے جو مغربی تہذیب اور مغربی رجحانات کو سمجھتے تھے، ہندوستان کی فضا میں اسے سمونے کی کوشش کی۔

سبط حسن، سجاد ظہیر کے بارے میں لکھتے ہیں،

> "انگلستان کے قیام کے دوران میں انہوں نے سامراجیت کے خلاف تحریکوں میں کُھل کر حصہ لیا، اور سوشلزم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ سجاد ظہیر بنیادی طور پر ادبی مزاج رکھتے تھے، چنانچہ لندن میں ان کے تعلقات آڈن، لوئیس میکنیس، اسٹیفن، اسپینڈر، رالف فوکس، جیک لنسنے، ڈیوٹ گیسٹ، کھنٹور تھ اور ملک راج آنند ایسے اہم ادیبوں اور شاعروں سے ہوگئے تھے جو ان دنوں ترقی پسند رجحانات کے لیے مشہور تھے، سجاد ظہیر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے"۔(۳)

ترقی پسند تحریک مختلف ادوار میں تقسیم رہی، اِس کا پہلا دور جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اِس زمانے میں نہ صرف جمود کو توڑنے کی کوشش کی گئی بلکہ جذباتی نظریات و خیالات کو پس پشت ڈال کر ہر اُس چیز پر بحث و تنقید کی گئی جس کا تعلق انسان کی ذات سے تھا۔ اِس طرح اردو ادب کو ایک دلچسپ اور وسیع میدان ملا۔ جہاں تک نسیم حجازی کا تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے ناول "انسان اور دیوتا" میں بھی اُس جدوجہد کو پیش کیا، جو بحث و تکرار سے شروع ہوتی ہے اور بالآخر انسان کی ایک عظیم جدوجہد پر ختم ہوتی ہے۔ آپ نے ہندوستان کی تاریخ سے جذباتی اور احساساتی عنصر کو نکال کر معاشرتی زندگی کی وہ حقیقی تصویر پیش کی جہاں پر ہر انسان صرف ایک ہی سوچ کا مالک ہو۔ آپ اپنے ناول "انسان اور دیوتا" میں لکھتے ہیں،

> "آپ نے مجھے غلط سمجھا، میں بزدل نہیں، مجھ سے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اپنی زندگی کا آرام ڈھونڈ کر دوسروں سے بے پرواہو جاؤں۔ لیکن گرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے کے متعلق میرے خیالات آپ سے بہت مختلف ہیں۔ میں طاقتور کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمزور کو پیس ڈالے۔ میں دنیا میں طاقت نہیں، انصاف کا قانون چاہتا ہوں۔ طاقت کا قانون انسانوں کو ذہنی طور پر درندہ بنا دیتا ہے۔ اور اِس دنیا میں ایک ایسی جنگ کا بیج بوتا ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ظالم کمزور ہو کر مظلوم اور مظلوم طاقتور ہو کر ظالم بنتے رہیں گے۔ غلام، آقا اور آقا غلام بنتے رہیں گے۔ اس دنیا میں نہ کمزور کی غلامی چاہتا ہوں اور نہ طاقتور کی بادشاہت میں طاقت کے لیے نہیں انصاف کے لیے لڑنا چاہتا ہوں اور دنیا میں انصاف کا قانون وہ ہو گا۔ جو آقا اور غلام کے وجود سے منکر ہو، جس میں چھوت چھات اور اچھوت کا امتیاز نہ ہو۔ جو انسان کو انسان کے احترام پر مجبور کرے جس کا خوف ایک طاقتور کو کمزور کے گھر پر قبضہ کرنے سے باز رکھ سکے"۔(۴)

ترقی پسند تحریک نے زندگی کے اُن فطری تقاضوں کو بھی اپنے اندر سمیٹا جہاں کا تصور کچھ اِس طرح سے گڑا ہوا تھا کہ افراد کی ذہنی تشکیل اپنے پورے جذباتی ہیجان کی بدولت نمایاں تھی۔ ترقی پسند تحریک نے انمٹ نقوش چھوڑے۔ بہر حال ترقی پسند تحریک کا ایک اہم موڑ اُس وقت آیا جب تقسیم ہند کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اِس تقسیم نے جہاں لاکھوں انسانوں کو جسمانی طور پر تقسیم کیا، وہیں ذہنی طور پر بھی تقسیم کیا، اب نئے حالات تھے، نئے مسائل تھے، نئے ملک تھے، اور سب سے بڑھ کر نئے سیاسی و سماجی رویے سامنے آرہے تھے۔ بھوک، افلاس، قتل و غارت گری، پست ذہنیت، استیحصال، ہجرت جیسے مسائل سر اٹھا رہے تھے۔ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں اِس بدلتی ہوئی صورتحال کو کچھ یوں پیش کیا، آپ ناول "خاک اور خون" جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا لکھتے ہیں،

> "ہندوستان نے دہلی اور مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمانوں کو ملک بدر کیا۔ تو وہ مغربی پاکستان آ گئے۔ بہار اور مغربی بنگال کے مسلمان مشرقی پاکستان میں پناہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان نے جونا گڑھ پر چڑھائی کی تو وہاں سے مسلمانوں کے قافلے کراچی اور سندھ پہنچنے لگے۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج داخل ہوئی تو کشمیری مہاجرین کے لیے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں کیمپ کُھل گئے۔۔۔ پاکستان مہاجرین کی جائے پناہ ہے، پاکستان انصار کا قلعہ ہے پاکستان وہ ساحل ہے۔ جہاں ہم خون کے دریا عبور کرنے کے بعد پہنچے ہیں۔ پاکستان وہ منزل ہے جس کے راستوں کی کھائیاں ہم نے اپنی لاشوں سے پاٹی ہیں۔ پاکستان وہ درخت ہے جسے ہم نے اپنے خون اور آنسوؤں سے سینچا ہے۔۔ پاکستان وہ چار دیواری ہے۔ جس کے اندر قوم کی منتشر قوتیں جمع ہو رہی ہیں اور پاکستان کے انصار اور مہاجرین کے لیے یہ سوچنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہے کہ اگر وہ کفر کے سیلاب کو اس چار دیوار سے دور نہ رکھ سکے تو اس کا انجام کیا ہو گا"۔(۵)

جیسے جیسے حالات و واقعات تبدیل ہوتے جاتے ہیں، ویسے ویسے انسان کی سوچ اور فکر میں تبدیلی رونما ہوتی جاتی ہے، ایک ایسا معاشرہ جو ابھی تبدیلی کے مراحل میں ہو، اور ان گنت مسائل درپیش ہوں، تو یقیناً ضرورت اِس بات کی محسوس کی جاتی ہے کہ ایک ایسی فضا ہر وقت تیار ہو جو افراد کو اور معاشرہ کو حرکت میں رکھے اِس کے لیے کوئی تحریک جو ایک مضبوط نظریہ رکھتی ہو لازمی قرار پاتی ہے۔

انسان کی زندگی ایک ایسے عمل کا نام ہے جہاں ہر لمحہ تغیرات جنم لیتے رہتے ہیں، اور اِن بدلتی ہوئی کیفیات کو اگر یکسانیت سے دور رکھا جائے تو ہمہ وقت ارتقائی عمل جاری رہتا ہے جو کسی بھی انسان کے لیے ضروری ہے۔ بعض اوقات جب کوئی تحریک جنم لیتی ہے تو اِس کے ردِ عمل میں کوئی نہ کوئی دوسرے نظریہ ضرور سامنے آتا ہے، تاکہ وہ خیال جس کی وجہ سے بعض افراد متفق نہ تھے اور معاشرے میں ایک فاصلہ آ گیا تھا اُس کو ختم کرنے کے لیے دوسرا نظریہ کا وجود لازم ٹھہرتا ہے۔ اِسی طرح جب ترقی پسند تحریک سامنے آئی اور اُس کے اثرات چار سُو پھیلنے لگے تو تقسیم ہند کے واقعہ نے اِس تحریک پر جو اثرات مرتب کیے اُس نے معاشرے میں فاصلے پیدا کر دیے، یوں ردِ عمل کے طور پر تحریکِ ادب اسلامی وجود میں آئی۔

"زمانی اعتبار سے ادب اسلامی کی تحریک آزادی کے بعد معرض وجود میں آئی۔۔۔یہ تحریک ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر رونما ہوئی اور اِس نے بیش تر ایسے ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش کی جنھیں اس سے قبل ترقی پسند تحریک آزما چکی تھی۔ چنانچہ تحریک کی جہت متعین کرنے اور ادبا میں اجتماعیت کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے اس تحریک نے بھی اپنا منشور تیار کیا اور رفقائے تحریک نے اس پر قبولیت کے دستخط کیے۔ تحریک ادب اسلامی کے منشور کی داخلی جہت اسلام کی طرف تھی اور یہ تحریک زمینی رشتوں کی یکسر نفی کر کے ایسا نظام قائم کرنے کی داعی تھی جو اسلام کی اساسی روح کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہو۔ اس تحریک کی خارجی جہت نے الحاد، بے دینی، فحاشی اور عریانی کو نشانہ بنایا اور بلاواسطہ طور پر ہر اس نظام فکر کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا جو اسلام کے نظریات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا"۔(۶)

جس طرح کسی بھی فن کو خام مواد کی ضرورت ہوتی ہے، اِسی طرح ادب زندگی اور سماج سے یہ مواد حاصل کرتا ہے، اِسی طرح اس تحریک نے بھی زندگی اور معاشرے سے جو اُمور حاصل کیے اُن پر سیر حاصل بحث تو ضرور کی لیکن چونکہ دائرہ عمل محدود تھا اِس لیے ایک مضبوط نظریاتی اساس کے باوجود وہ علمی استدلال پیدا نہ ہو سکا، جو ہونا چاہیئے تھا۔ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں اُس اسلامی نقطہ نظر کو اُجاگر کیا جس پر عمل کر کے مسلم امہ دنیا پر حکمرانی کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں میں جو خیر و شر کا تصور پایا جاتا ہے، تقدیر و تدبیر میں کیا حد فاصلہ ہے، پھر اِس کے ساتھ ساتھ وہ نفسیاتی اُمور جن کی بدولت کوئی بھی فرد ایک سماج میں تعمیری کردار ادا کرتا ہے، اِن سب رجحانات کو حقیقت بینی سے مشاہدات کی کسوٹی پر پرکھا۔ نسیم حجازی کا ذہن اسلامی نظریاتی اعتبار سے فاصلہ پختگی کا حامل تھا۔ اِسی لیے آپ کے ناولوں کے کردار نہ صرف مبلغ ہیں بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی باعمل۔ آپ اپنے ناول "شاہین" میں لکھتے ہیں،

"اہلِ غرناطہ میں تمھارے مرجھائے ہوئے چہروں پر اس قوم کی تقدیر کا فیصلہ پڑھ رہا ہوں جس نے اِس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری چیخ و پکار تم پر کوئی اثر نہیں کرے گی۔ تمہاری رگوں میں وہ خون خشک ہو چکا ہے جسے الفاظ جوش میں لا سکتے ہیں۔ لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ میری آواز ایک بار پھر اس ایوان کی دیواروں سے ٹکرا کر فضا میں گم ہو جائے گی میں تم سے کچھ کہنے پر مجبور ہوں۔۔۔

تمھیں اپنے اسلاف سے وراثت میں حکومت ملی تھی اور تم اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کیا چھوڑ کر جا رہے ہو؟ غلامی۔۔ذلت اور رسوائی!۔۔۔۔

یہ آسمان جس نے آٹھ سو برس تک ہمارے بزرگوں کی تلواریں دیکھی ہیں ہمارے پیروں میں غلامی کی زنجیریں نہیں دیکھے گا۔ قیامت کے دن ہمارے دامن خون شہادت سے رنگین ہوں گے لیکن اس پر غلامی اور ذلت کی سیاہی کے داغ نہیں ہوں گے"۔(۷)

یہ تحریک اگرچہ اپنی ساخت برقرار نہ رکھ سکی، لیکن جو خلوص اور نظریاتی گہرائی اس میں پائی جاتی تھی، اُس نے نسیم حجازی کو فکری و نظریاتی طور پر یوں ضرور متاثر کیا کہ اس تحریک کے افکار و خیالات ہمیں آپ کے ناولوں میں ملتے ہیں۔

نسیم حجازی کے ادبی زمانے میں مذہبی، اقدار اور اخلاقی معیارات کا جو فرق معاشرے میں آہستہ آہستہ رونما ہو رہا تھا، اُس نے تحریکوں کو مختلف زاویے عطا کیے۔ یوں ایک منفرد زاویہ حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک بھی کہلایا:

"۔۔۔ایک ایسی تحریک بھی مائل بہ عمل نظر آتی ہے جس نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کو توڑنے کی کوشش کی اور نہ صرف زندگی کے خارج کو مناسب اہمیت دی بلکہ انسان کے داخل کی پُراسرار آواز کو بھی بگوش ہوش سُنا۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک تھی اور اس نے بیش تر رومانی تحریک کے ان اثرات کو قبول کیا جو فرد کو زندگی کی مادی آلائشوں سے بلند ہونے اور متخیّلہ کی گھمبیر گہرائیوں سے انکشاف ذات اور عرفان حیات پر مائل کرتے ہیں"۔(۸)

نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں زندگی کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کی جو عکاسی کی اُس میں روحانیت کا ایک گہرا رنگ بھی شامل ہے۔ نسیم حجازی اپنے ناول "محمد بن قاسم" میں لکھتے ہیں،

"زبیر دیکھو یہ ستارہ کس قدر اہم ہے لیکن اِس کی زندگی کتنی مختصر ہے یہ دنیا کو ہر صبح آفتاب کی آمد کا پیام دینے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سورج کے چہرے سے تاریکی کا نقاب اُلٹ کر اپنے چہرے پر ڈال لیتا ہے لیکن اِس کے باوجود جو اہمیت اُسے حاصل ہے، وہ دوسرے ستاروں کو حاصل نہیں اگر یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح تمام رات چمکتا تو ہماری نگاہوں میں اُس کا رُتبہ اس قدر بلند نہ ہوتا۔ ہم تمام رات آسمان پر کروڑوں ستارے دیکھتے ہیں، لیکن یہ ستارا ہمارے لیے ان سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے عام ستاروں کی موت و حیات ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

بالکل ان انسانوں کی طرح جو دنیا میں چند سال ایک بے مقصد زندگی بسر کرنے کے بعد مر جاتے ہیں اور دنیا کو اپنی موت و حیات کا مفہوم بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زبیر مجھے اس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس کی زندگی جس قدر مختصر ہے اسی قدر اس کا مقصد بلند ہے۔ دیکھو! یہ دنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر اظہار تاسف نہ کرو۔ قدرت نے مجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اس ملک میں آفتابِ اسلام کے طُلوع ہونے سے پہلے صبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں!"۔(۹)

اِس تحریک نے نہ صرف فرد کے احساس کو اہمیت دی بلکہ جذبے اور خیال کو بھی اولیت عطا کی۔ احساسات کی ترجمانی جو فرد کسی بھی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے پر ظاہر کرتا ہے۔ نسیم حجازی نے اپنے ناول "آخری چٹان" میں اسے کچھ اِس انداز سے بیان کیا ہے۔

"بغداد میں ہم اپنا فرض پورا کر چکے ہیں۔ جو لوگ خودکشی کا ارادہ کر چکے ہوں انھیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ جب ایک ایسی قوم کو جو طوفان میں غرق ہونے کا ارادہ کر چکی تھی، نوح علیہ اسلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی تباہی سے نہ بچا سکے تو ہم کون ہیں؟ ہم نے اہل بغداد کو ان کے راستے کے مہیب گڑھے دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے چلنے پر مُصر ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ خوارزم کے شہر ان کے سامنے ایک ایک کر کے تباہ ہوئے لیکن قدرت کی طرف سے بار بار تنبیہہ کے باوجود انھوں نے عبرت حاصل نہیں کی۔

اہلِ بغداد تنزل کی اس آخری گہرائی تک پہنچ چکے ہیں جہاں سے انھیں اٹھانا کسی انسان کا کام نہیں۔ جس بستی کے ہر پانچ آدمیوں میں سے ایک غدار ہو، اُسے تباہی سے کون بچا سکتا ہے؟ ایک قوم کو تباہ کرنے کے لیے مہلب جیسا ایک آدمی کافی ہوتا ہے اور بغداد میں تو ہزاروں مہلب ہیں"۔(۱۰)

بہر حال اِس تحریک نے نہ صرف انسانی فطرت کا قریب سے مشاہدہ کیا، بلکہ انسانوں میں موجود اُن جذبوں کی بھی بھرپور عکاسی کی، جن کا اظہار انسان کُھلے الفاظ میں نہ کر پاتا۔ انسان کی کیفیت اُس کے جذبوں کی عکاسی کرتی ہے اور زندگی کو شعور کی اِس نگاہ سے دیکھنا کہ نہ صرف کِردار کے خدوخال واضح ہو جائیں بلکہ کِردار کی سوچ، اُس کے تاثرات اور تہ بہ تہ چھپی ہوئی وہ خواہش جو فرد کے کِردار کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اُس مرکزی نقطے پر آکر جمع ہو جاتی ہے جسے ہم محبت کا نام دیتے ہیں۔ یہ سب وہ انسانی فِطرت ہیں جسے ہم انسان کی داخلی و باطنی کیفیت کا نام دیتے ہیں۔ حلقہء اربابِ ذوق کی تحریک میں "ممتاز مفتی" کا نام اِس لیے بھی نمایاں ہے کہ آپ نے افسانوی نقطہ نظر سے اِس بات کو نمایاں کیا کہ کسی بھی معاشرے میں فرد کی ذاتی خوشی کو اہمیت دی جانی چاہیئے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف ممتاز مفتی کے متعلق رقمطراز ہیں:

"معاشرتی اقدار و روایات کا تعلق محض ظاہری عمل اور بناوٹی برتاؤ سے ہے، جو معاشرے میں منافقت اور دوغلے پن کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ سماجی طور پر مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش حقیقی خیر اور سچائی سے دوری پیدا کرتی ہے اور زندگی کے بارے میں درست اور گہرا وژن پیدا کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے بطون ذات کی سچائی تک پہنچنے کے لیے جس وسعتِ نظر اور فراخی قلب و ذہن کی ضرورت ہے وہ مروجہ معاشرے میں ناپید ہے۔ رسمی اخلاق اور مصنوعی اقدار کے کڑے اصول و ضوابط زندگی کی حقیقی مسرت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور انسانیت کے فطری اور قدرتی طریقے سے پھلنے پھولنے کے امکانات مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ احساسات تھے جنھوں نے ممتاز مفتی کے دل و دماغ پر گہرے اور دیرپا نقوش قائم کیے اور انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی رویے اور اعمال و افعال کے دورُخے پن کو نہایت دلچسپی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیاں سماج کو آئینہ دکھاتی اور اس کے کریہہ المنظر حقائق کو طشت از بام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ انسانی فِطرت کے باریک اور دقیق راز کھول کر بیان کرنے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور ظاہر و باطن کے امتیازات کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں"۔(۱۱)

پاکستان بننے کے بعد اردو ادب میں وطن سے محبت کا جو جذبہ اُبھرا اُس کے اثرات آپ کے ناولوں میں بھی نمایاں طور پر ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ ادبی تحریکوں کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر خود بخود ایسے حالات پیدا کر جاتیں ہیں جو وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اب ضرورت تھی اُس ثقافت کی اپنی پہچان کی جو تقسیم ہند کے بعد اِس سرزمین کو کرانی تھی۔ یوں پاکستانی ادب سے جو نقطہ نظر سامنے آیا وہ ارضی ثقافتی تحریک کے نام سے سامنے آئی:

> "پاکستانی ادب کی تحریک نے جن فکری مسائل کو اُبھارا تھا۔ اُن کی نسبتاً بدلی ہوئی صورت ارضی ثقافتی تحریک میں رونما ہوئی۔ اس تحریک نے اقبال سے یہ نظریہء اکتساب کیا کہ ثقافت اور اس کا مظہر ادب، زمین اور آسمان کے رشتوں سے متشکل ہوتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے اس حقیقت کو اخذ کیا کہ تخلیق میں زمین بنیادی حقیقت رکھتی ہے۔ اِس تحریک کا امتیازی نکتہ یہ ہے کہ اس نے مذہب کو زمینی رشتوں کی تہذیب کا ایک مقدس انعام اور انسانی شعور کو لاشعور میں پھوٹنے والا چشمہ قرار دیا"۔(۱۲)

ارضی ثقافتی تحریک نے ادب کو جو گہرائی عطا کی اُس میں جذبے کی شدت اور وطن سے محبت کا احساس اِن معنوں میں بھی پیدا کیا کہ اگر وطن نہ ہو تو افراد کہاں جائیں، اِس خوف نے ادیب کو اظہار کو موقع دیا۔ یوں نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں اِس خوف کو ایک ایسی فکر کے طور پر پیش کیا۔ جہاں وطن سے محبت اور گرد و پیش کے حالات کو جاننا اور پہنچنا قرار پاتا ہے۔ آپ اپنے ناول "کلیسا اور آگ" میں لکھتے ہیں:

> "میری نگاہوں کے سامنے اُس دور کی داستانیں دہرائی جارہی ہیں جب اندلس کے مسلمانوں مور سکوز بن گئے تھے۔۔۔ جب مور سکوز اس الزام میں زندہ جلائے جاتے تھے کہ وہ دل سے عیسائی نہیں ہوئے اور ابھی تک اپنے اسلاف کے دین سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ جب انکوی زیشن کے اذیت خانوں میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔۔۔
>
> اور جب میں اس بھیانک ماضی سے حال کی طرف لوٹتا تھا۔۔۔ جب میں یہ دیکھتا تھا کہ یہ میرا کمرہ ہے جہاں کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔۔۔
>
> یہ وہی گھر ہے جہاں میرے بچے رہتے ہیں۔۔۔
>
> میں اسپین کا مور سکوز نہیں بلکہ پاکستان کا مسلمان ہوں تو بے اختیار میرے دل سے یہ دعائیں نکلتی تھیں!
>
> میرے اللہ پاکستان پر اپنا کرم فرما! یہ ہمارے آخری حصار ہے اور ہمارے لیے یہاں سے پسپائی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔۔۔
>
> تیرے عاجز بندوں کی یہ جائے پناہ کسی نئے عبداللہ یا ابوالقاسم کے گناہوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔۔۔

رب العالمین! ہمیں ان لوگوں کے شر سے بچائیو، جو ہمارے قومی تشخص اور ملت اسلام سے ہمارے تاریخی رشتوں کو کاٹنا چاہتے ہیں۔ آمین!"۔(۱۳)

نسیم حجازی کا ادبی زمانہ اِس لحاظ سے ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے کہ اِس زمانے میں اردو ادبی تحریکوں نے نہ صرف پورے معاشرے کو متاثر کیا بلکہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات، تقسیم ہند اور پھر پاک وہند جنگوں نے جس طرح لاکھوں افراد کو جسمانی و ذہنی طور پر تقسیم در تقسیم کر کے رکھ دیا تھا، اُن عوامل نے اِن تحریکوں کی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ معاشرے کو یہ احساس بھی دلایا کہ انسان کی سوچ چاہے مادی ہو یا روحانی یا پھر وہ کسی بھی خطے یا قومیت سے تعلق رکھتا ہو، اِن تحریکوں کے اندر اتنا شعور ضرور ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے خطے کو متاثر کر سکیں۔ نسیم حجازی جو اپنے ناولوں کے ذریعے ماضی حال اور مستقبل کی شاہراہوں پر اپنے کرداروں کو لے جاتے ہیں، اُن کی تحریروں میں ہمیں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ بارش کا پہلا قطرہ اگرچہ زمین کو مکمل طور پر بھگوتا تو نہیں لیکن یہ اُمید ضرور دکھاتا ہے کہ انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ کی تحریروں میں ہمیں ادبی تحریکوں کے وہ رجحانات ضرور ملتے ہیں، جن سے ہمیں سماج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ نسیم حجازی کی فکری سوچ نے ادبی تحریکوں سے حاصل ہونے والے اثرات کو قبول کرتے ہوئے معاشرتی رجحانات کو پیش کیا۔

جب ہم نسیم حجازی کے ادبی سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ آپ جب ناول نگاری کی جانب متوجہ ہوئے تو ہمارے ادبی معاشرے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں ہو کر مختلف تجربات سے انسانی زندگی کے مسائل کو اور نئی تشریحات کے ساتھ انسان کی بقاء و مسائل سے نبرد آزما تھے، یہ اور بات ہے اس ساری بحث میں انسان کہیں کھو گیا تھا شاید اِس لیے کہ اُسے اُس کے ماضی سے کاٹ کر مستقبل سے جوڑ دیا گیا، یوں اُس کا اصل توازن بگڑ گیا اور انسان خود مثبت و منفی پہلوؤں میں سمٹ کر رہ گیا۔ اُس کی شناخت ختم ہو گئی۔ نسیم حجازی نے حالات و واقعات کے تناظر میں انسان کی ذات کو ماضی کا رشتہ یاد دلاتے ہوئے اُسے سمجھایا کہ جب تک ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھو گے اور وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے تناظر میں اپنی زندگی کے سبق کو یاد رکھو گے تو تمہارا حال بے مثال اور مستقبل شاندار ہو گا۔

مجنوں گورکھپوری اپنی کتاب "ادب اور زندگی" میں لکھتے ہیں:

> "ادب انسان کے بہترین خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور انسان کے جذبات و خیالات خلاء میں نہیں پیدا ہوتے بلکہ ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ماحول کے پیداوار ہوتے ہیں۔
>
> نئی نسل کے بعض جوشیلے نوجوان ترقی کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ ماضی سے بالکل رشتہ توڑ لیا جائے اور اسلاف کے کارناموں کو حرف غلط سمجھ کر بھلا دیا جائے۔ یہ ممکن نہیں۔ ترقی نام ہے، تواریخی تسلسل کا۔ ماضی کے پیٹ سے حال اور حال کے پیٹ سے مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ ترقی کی بنیاد گذشتہ اور موجودہ اکتسابات پر ہوتی ہے۔

تواریخی مادیت کا پہلا سبق یہی ہے کہ ایک نظام اور دوسرے نظام کے درمیان ربط و تسلسل ہوتا ہے۔ ایک تمدن گذشتہ تمدن کی ارتقائی صورت ہوتا ہے۔ اور آئندہ تمدن کا پس منظر گویا ہر تمدن مخلوق بھی ہوتا ہے اور خالق بھی۔ ہم کبھی اِس بات پر دھیان نہیں دیتے ورنہ ہم کو اسلاف کے کارناموں میں ایسے ارتعاش محسوس ہوسکتے ہیں جو صاف پتہ دیتے ہیں کہ آئندہ نسل کے کارنامے کیسے ہونگے "(۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان جس حالات و واقعات سے دوچار رہتا ہے اور جس قسم کی سوچ و فکر رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب وہ معاشرتی الجھنوں کو دیکھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ سب کچھ سماج میں پایا جانے والا وہ عدم توازن ہے، جسے خود انسان نے تخلیق کیا ہوا ہوتا ہے۔

ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نسیم حجازی نے ناول نگاری میں ناول کو جیسے ایک ایسے وقت کے تابع کر دیا ہے، جو انھیں نہ صرف گزرتے واقعات کا آئینہ دکھاتا ہے بلکہ افراد کے ذہنوں کی سوچ کو حال کے معاشرتی سوچ اور مستقبل کے فکری رجحانات کی استقامت عطا کرتا ہے۔ حالات سے مقابلہ کرنا اپنے کِردار کو نئی سوچ کے ساتھ نئی دنیا کچھ اِس طرح تلاش کرنا کہ مسلم قوم یک جان و یک قلب ہو کر ساری دنیا پر حکمرانی کر سکے۔ جیسے وہ ماضی میں کیا کرتی تھی۔ لیکن اِس کے لیے اُسے اپنے اندر ایک انقلابی تبدیلیوں کو پیدا کرنا پڑے گا۔ جب مسلمانوں نے فطرت سے انکار کیا اور اپنے اندر شعور کو کسی بھی قسم کی کوئی جگہ نہ دی تو وہ پستیوں میں دھنستی ہی چلی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں تخلیق ہونے والا ناول "آخری معرکہ" جہاں اِس جانب اشارہ کرتا ہے کہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تو دوسری جانب ہمیں ایک ایسے عمل کی ترغیب دیتا ہے جس کے بعد واپسی ممکن ہی نہیں۔ اِس لیے پورے فکری، علمی اور شعوری طور پر اب مسلمانوں کو آگے بڑھنا ہے۔

۱۹۵۲ء یورپ میں تیزی سے بدلتا ہوا سماج ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجوہات اور اُس سے پیدا شدہ مسائل کو تیزی سے حل کیا جا رہا ہے۔ تصورات، مشاہدات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔ لیکن دوسری جانب مسلمان نہ جانے کن راستوں کے راہی بننا پسند کر رہے ہیں، جن کی نہ منزل ہے نہ مقصد۔ یوں نسیم حجازی کا ناول "آخری معرکہ" سومنات کے مندر کی اُس فتح کی یاد دلاتا ہے، جب محمود غزنوی نے ہندوستان کے معاشرے میں ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر ڈال کر اُس میں ارتعاش پیدا کیا تھا، اور اُس جمود کو توڑا تھا جو صدیوں سے یہاں کی ثقافت میں مذہب کے نام پر رچ بس گئی تھی۔ تاریخ کا یہ واقعہ نسیم حجازی اِس لیے بھی بیان کرتے ہیں کہ ناممکن کو ممکن بنانا صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنے اندر حوصلہ، صبر اور پہاڑوں جیسی استقامت رکھے۔ ۱۹۵۲ء میں اِس مملکت خداداد کو اِن جیسی ہی صلاحیتوں والے افراد کی ضرورت تھی جنھوں نے ناممکن کو دنیا کے سامنے ممکن بنا کر دکھایا۔

"مجاہدوں! یہ ہندوستان کی سرزمین میں کفر و اسلام کا آخری معرکہ ہے ہم سومنات کے ظلمت کدہ میں خدا کی توحید کا پرچم لہرانے کا عہد کیا ہے اور اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ فتح یا شہادت خدا کے بندوں کی سب سے بڑی

ڈھال اُن کا ایمان ہے اور اگر تمہارا ایمان متزلزل نہ ہوا تو ہم اس امتحان سے سُرخرو ہو کر نکلیں گے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ کل ہم جمعہ کی نماز سومنات کے قلعے میں ادا کریں"۔(۱۵)

جیسے جیسے پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات تبدیل ہوتے گئے، ویسے ویسے نسیم حجازی کی سوچ اور فکر اپنے اندر اُن خدشات کو جنم لینے لگی جہاں صدیوں پہلے مسلمانوں نے ہسپانیہ جیسی سلطنت کو کھو دیا تھا، احساسات و جذبات کے پہلوؤں کو آپ نے انسانی رویوں کے تناظر میں جب دیکھنا شروع کیا تو آپ کو پورے معاشرے میں بے رخی نظر آئی، اور یہ وہ عنصر ہے، جو جب پوری قوم میں سرایت کر جاتا ہے تو ایسی قوم اپنی منزل سے کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ نے آپ کے ادبی سفر کو اُس اذیت سے دوچار کر دیا جو آپ کی روح میں رچ بس گئی تھی، یوں ۱۹۷۷ء میں آپ نے "کلیسا اور آگ" کے نام سے ناول تحریر کیا۔ آپ اس ناول کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں،

"۔۔۔ایک قوم کی المناک داستان کا آخری باب ہے جو قریباً آٹھ صدیاں عروج و زوال کی منازل طے کرنے کے بعد اُس سرزمین سے نابود ہو گئی تھی جہاں آج بھی دنیا بھر کے سیاح اس کی عظمتِ رفتہ کی غیر فانی یادگاریں دیکھنے آتے ہیں۔۔۔

لیکن جو لوگ ایک قوم کے لیے وطن کی ضرورت کا احساس کر سکتے ہیں، پاکستان کے بقا کے لیے اس کی نظریاتی سرحدوں کی اہمیت سمجھتے ہیں اور اِس ملک میں اُندلس کی تاریخ نہیں دہرانا چاہتے، انھیں میں بار بار خبردار کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ قومی اتحاد نے، اللہ اور اُس کے بندوں کے ساتھ جو عہد کیا تھا، اس سے فرار کا راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔۔۔ گزشتہ تیس برس کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کے سوا ہماری آزادی اور بقا کی کوئی ضمانت نہیں۔

اُندلس میں مسلمانوں کی تباہی کا باعث وہ قسمت آزما تھے جنھوں نے قوم کی اجتماعی حیات کے سرچشمے زہر آلود کر دیے تھے۔۔۔ بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔۔۔

اور اقتدار کے جنون میں کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ قوم بھی زندہ رہنے کا حق رکھتی ہے جس کے اسلاف نے اس سرزمین پر اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی تھی"۔(۱۶)

نسیم حجازی کا ہ ادبی سفر جہاں مسلمانوں کی سماجی، معاشی، معاشرتی رویوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، وہیں مسلم معاشرے میں رونما ہونے والے تغیرات کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات بعض اوقات اقوام کی زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں، حکمرانوں کی ذہنی پستی قوم کو زوال کا شکار بنا دیتی ہے۔ جذباتی و احساساتی فضا کو ایسے تخلیق کیا کہ قاری خود کو تاریخ کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ معاشرے کی مردہ پرستی جس اضطراب کو جنم دیتی ہے، وہ افراد کے اندر مایوسی کو پیدا کرتی ہے، یوں اِس طرح طبقاتی کشمکش آخر کار پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، بہر حال نسیم حجازی نے اُن تمام عوامل کو مدِ نظر رکھا جس کی بدولت مسلمانوں نے اِن چودہ صدیوں میں عروج و زوال کی حیرت انگیز تاریخ مرتب کی۔ آپ کی تحریروں نے گہرے اثرات مرتب کیے۔

حوالہ جات:

۱۔ مجنوں گورر کھپوری، ادب اور زندگی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۴۰، ۵۵۔
۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۳ء، صفحہ ۴۴۲۔
۳۔ سبط حسن، مرتب ڈاکٹر سید جعفر احمد، ادب اور روشن خیالی، ۲۰۱۶ء، صفحہ ۹۶۔
٤۔ نسیم حجازی، انسان اور دیوتا، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۴۰۳، ۴۰۴۔
٥۔ نسیم حجازی، خاک اور خون، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۲۰۱۔
٦۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۳ء، صفحہ ۵۴۹، ۵۵۰۔
۷۔ نسیم حجازی، شاہین، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱۔
۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ء، صفحہ ۴۴۹۔
۹۔ نسیم حجازی، محمد بن قاسم، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۳۰۵۔
۱۰۔ نسیم حجازی، آخری چٹان، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۵۰۸، ۵۰۹۔
۱۱۔ نجیبہ عارف، ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء، ناشر الفیصل، لاہور، ۲۰۱۱ء، صفحہ ۳۰۲۔
۱۲۔ اردو ادب کی تحریکیں، ء، صفحہ ۵۶۱۔
۱۳۔ نسیم حجازی، کلیسا اور آگ، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۳، ۴۔
۱۴۔ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۶۳، ۱۰۹۔
۱۵۔ نسیم حجازی، آخری معرکہ، جہانگیر بکس، کراچی، صفحہ ۵۲۴۔
۱۶۔ آگ اور کلیسا، صفحہ ۱، ۸، ۹۔

☆☆☆☆☆